ہندستان آزادی کے بعد

مولانا وحید الدین خان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہندستان آزادی کے بعد

ہندستان کی آزادی ہمارے ملک کے لیے اس صدی کا سب سے بڑا واقعہ ہے، یہ وہ واقعہ ہے جس کو وجود میں لانے کے لیے پچھلے ایک سو سال سے ہمارے ملک کے بہترین دماغ اور بہترین ذرائع و وسائل لگے ہوئے تھے، اور جس کے لیے سارا ملک چشم براہ تھا۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے لوگ کس درجہ بے قرار تھے، اس کا اندازہ آپ دو واقعات سے کر سکتے ہیں۔ امرت بازار پتریکا کے سابق اڈیٹر آنجہانی موتی لال گھوش ۱۹۲۰ء میں انتقال کرنے لگے تو انہوں نے کہا: ''اب میں ایسی دنیا میں جا رہا ہوں جہاں برطانی راج نہ ہوگا۔''

دوسرا واقعہ جنوری ۱۹۳۱ء کا ہے جب مولانا محمد علی مرحوم گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تھے۔ وہاں انہوں نے اپنی تاریخی تقریر میں کہا:

> ''اب میں آزادی لیے بغیر اپنے غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ اگر آپ نے ہندستان میں ہمیں آزادی نہیں دی تو یاد رکھئے کہ آپ کو اپنے یہاں مجھے قبر کی جگہ دینی ہوگی۔''

ان دو واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت کے دور میں جو لوگ ہندستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے، اس معاملے میں ان کے جذبات کس قدر شدید تھے۔ ہندستان کو آزاد دیکھنے کی یہ تڑپ جو ملک کے باشندوں میں تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے ملک کو اپنی مرضی کے مطابق بنانا چاہتے تھے، وہ گنگا جمنا کے اس دیس میں ایک ایسی بھرپور اور شاداب زندگی دیکھنے کے خواہش مند تھے جو یہاں کے باشندوں کو سکھ اور چین سے مالا مال کر دے۔ وہ اپنی پسند کے مطابق، ایک ''نیا ہندستان'' بنانا چاہتے تھے جس کا موقع دوسرے کی حکومت میں نہیں مل سکتا تھا۔ اسی حقیقت کو جدوجہد آزادی کے سب سے بڑے لیڈر مہاتما گاندھی نے ایک مرتبہ ان لفظوں میں ادا کیا تھا: ''میرا مشن ہر آنکھ کے آنسو پوچھنا ہے۔''

یہ آواز تمام ہندستانیوں کے دل کی آواز تھی۔ یہی وجہ تھی جب کانگریس آزادی اور فلاحی ریاست

(Welfare State) بنانے کی تحریک لے کر اٹھی تو سارے ملک نے متفق ہو کر اس کا ساتھ دیا اور اس زور وشور سے دیا کہ انگریزی حکومت کی ساری طاقت اس کے خلاف عاجز ہو کر رہ گئی۔ آزادی کے نعرے پر پورا ملک کس طرح اُمڈ پڑا تھا، اس کا اندازہ اس چھوٹے سے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں پنڈت نہرو ایک جلوس کی قیادت کر رہے تھے جو آزادی کے مطالبہ کے لیے اٹھا تھا۔ انگریز حکام نے اس جلوس کو روکنے کا فیصلہ کیا اور دفعہ ۱۴۴ کا نوٹس جاری کر کے پولیس کے ایک افسر کو روانہ کیا کہ وہ اسے پنڈت نہرو تک پہنچا دے۔ مگر جلوس کے ساتھ آدمیوں کی بھیڑ اتنی زیادہ تھی کہ پولس افسر پنڈت نہرو کی کار تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوا، اور نوٹس پر تعمیل نہ کیا جاسکا۔

اس کے بعد بالآخر وہ مبارک وقت آیا جب کہ انگریز اس ملک کو ملک والوں کے ہاتھ میں دے کر یہاں سے واپس چلا گیا۔ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کی شام ہم میں سے اکثر لوگوں کو یاد ہوگی۔ یہی وہ شام ہے جب کہ ہندستان کو آزادی ملی، اس روز ہندستان کا ایک ایک شہر چراغوں کی روشنی سے جگمگا اٹھا تھا۔ سارے ملک نے بڑے دھوم کے ساتھ آزادی کی خوشی منائی تھی۔ مگر اگلے دن جب ہم سو کر اٹھے تو تمام چراغ بجھ چکے تھے اور اس کے بعد وہ پھر کبھی نہیں جلائے گئے۔ اب بھی پندرہ اگست آتی ہے، مگر ملک کو اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ عام شہریوں کے نزدیک اس کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ کیلنڈر میں ۱۵/اگست کی تاریخ سرخ روشنائی سے چھپی ہوئی ہوتی ہے، جو اس بات کا نشان ہے کہ آج تمام سرکاری دفتروں اور بینکوں میں تعطیل ہوگی۔ اب ۱۵/اگست صرف ایک سرکاری تہوار ہے جس میں سرکاری عمارتوں میں کچھ تقریبات ہوتی ہیں اور اسکول کے ماسٹروں کو احکام بھیج دیے جاتے ہیں کہ وہ بچوں کا جلوس لے کر نکلیں اور سڑکوں اور گلیوں میں کچھ نعرے لگوا دیں۔

یہ آزادی جو ایک صدی کی کوششوں کے نتیجے میں حاصل ہوئی تھی —— چند سال بھی نہیں گزرے تھے کہ لوگ اسے بھول گئے بلکہ اب تو آپ بعض زبانوں کو یہ کہتے ہوئے سنیں گے کہ ''انگریزوں کا دور اس آزادی کے زمانے سے بہتر تھا۔'' آزادی کو ملے ہوئے ۳۵ سال سے زیادہ ہو چکے ہیں مگر اب بھی ہماری سڑکوں پر ''انقلاب زندہ باد'' کے نعرے لگتے ہیں اور وزیروں اور گورنروں کو کالی جھنڈیاں دکھائی جاتی ہیں، جس طرح وہ انگریز حکمرانوں کو دکھائی جاتی تھیں۔

ایسا کیوں ہے، کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں ہندستان کی باگ ڈور آئی ہے وہ اس کی ترقی کے لیے کوئی کام نہیں کر رہے ہیں؟ ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے فوراً بعد

سے ہندستان میں حالات کو درست کرنے کی مسلسل کوشش ہو رہی ہے۔ بے شمار اصلاحی قوانین اور ضابطے بنائے گئے ہیں۔ بہت سے نئے نئے محکمے اور مختلف محکموں کے تحت نئے نئے شعبے قائم کئے گئے ہیں، ملکی آمدنی ملک کے مفاد کے مطابق صرف کرنے کے لئے خصوصی ماہرین کی مدد سے منصوبے تیار کئے گئے ہیں۔ سماجی مفاد کی خاطر کتنے لوگوں کی شخصی ملکیتیں چھین لی گئی ہیں اور عمومی مفاد کے لیے ذاتی مفاد کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اتر پردیش کی حکومت ۱۹۵۵ء میں پبلک مفاد کے کاموں پر ہر منٹ میں ۱۳۴۴، ۲ روپے خرچ کر رہی تھی، جو اس مد میں آزادی سے فوراً پہلے (۴۷-۱۹۴۶) خرچ کی جانے والی رقم سے چالیس فیصدی کے بقدر زیادہ ہے[1]۔ اسی طرح ہندستان کی تمام ریاستیں ہر سال بے شمار روپیہ خرچ کرتی ہیں۔ ایک طرف یہ ترقیاتی کوششیں ہیں جو سالہا سال سے مسلسل جاری ہیں۔ دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ ہمارے مسائل میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری ترقیاتی اسکیموں نے ہم کو صرف مشکلات و مصائب کا تحفہ دیا ہے۔ ہمارے ملک کا حال اس وقت ایک ایسی ٹنکی کا سا معلوم ہوتا ہے جس کا پینداٹوٹ گیا ہو، ظاہر ہے ایسی ٹنکی میں جو پانی بھرا جائے گا وہ بہہ کر باہر نکل جائے گا، اسی طرح ہماری زندگی میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے کہ اصلاح و ترقی کے سارے منصوبے بے کار ثابت ہو رہے ہیں، اور ہزار کوششوں کے بعد بھی اصل مقصود حاصل نہیں ہوتا۔

یہ خلا کیا ہے؟ اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھئے۔ ایک شخص کو "سماجی بہبود" کا افسر بنایا جاتا ہے۔ اس کی ڈیوٹی یہ مقرر ہوتی ہے کہ وہ سماج سے رابطہ قائم کرے۔ حکومت کی طرف سے لوگوں کے لیے جو رعایات اور جو اعانتیں جاری ہوں ان کو مستحقین تک پہنچائے۔ مگر عملاً یہ ہوتا ہے کہ عوام کے لیے جاری کی ہوئی رقموں کا بڑا حصہ خود اس افسر کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ قیمتی دوائیں جو غریبوں میں تقسیم کرنے کے لیے دی جاتی ہیں وہ زیادہ تر بلیک مارکیٹ میں فروخت کر دی جاتی ہیں۔ اس کو کبھی اناج خریدنا نہیں پڑتا کیوں کہ قلّت کے علاقوں میں تقسیم کے لیے جو اناج حکومت کی طرف سے ملتا ہے وہ اس کے خاندان کی ضروریات سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کون سا خلا ہے جس کی وجہ سے ہماری تمام ترقیاتی کوششیں ناکام ثابت ہو رہی ہیں۔ وہ خلا یہ ہے کہ ہمارے تمام سرمائے کو وہ طبقہ اچک لیتا ہے جو ہمارے اور ان اسکیموں کے درمیان ہے۔ ہمارے پاس جو دولت اور جو قدرتی وسائل ہیں ہم ان کو عوام تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر ظاہر ہے کہ

---

[1] نیشنل ہیرالڈ ۲۶ر فروری ۱۹۵۵ء

وہ خود بخود عوام تک نہیں پہنچ جائیں گے بلکہ وہ درمیانی کارکن اور عہدیدار ہوں گے جو اس کو ملکی خزانے سے لے کر عوام تک پہنچائیں گے۔ اس لیے کسی اسکیم کا انجام تمام تر اس درمیانی طبقے کی کارکردگی پر منحصر ہے۔ ہمارے یہاں اس قسم کا جو درمیانی طبقہ ہے اس کی بدعنوانیاں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ ہماری تمام اصلاحی کوششیں محض کاغذی کارروائی بن کر رہ گئی ہیں۔ کاغذ کی دنیا میں منصوبے بنتے ہیں، ان پر عمل درآمد ہوتا ہے، ان کے شاندار نتائج نکلتے ہیں۔ مگر عمل کی دنیا ان تمام چیزوں سے بے خبر رہتی ہے۔ ان کی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی ہے۔

غلے کی نازک صورت حال کے پیش نظر ایک ریاست میں یہ قانون بنایا جاتا ہے کہ ریاست کا غلہ ریاست کے باہر نہ جانے پائے، مگر اگلے سال ریاستی اسمبلی کے اجلاس میں ایک ممبر اس الزام کی تحقیق کا مطالبہ کرتا ہے کہ فلاں وزیر نے بہت بڑی مقدار میں اناج ریاست کے باہر اسمگل کر کے لاکھوں روپیہ ناجائز طور پر کمایا ہے۔ دوسرا ممبر کھڑا ہو کر اس کی تائید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اور محترم وزیر پندرہ سال سے ساتھ رہ رہے ہیں اور ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے بیٹوں نے کولڈ اسٹوریج اور بڑے بڑے سینما گھروں کی تعمیر کے لیے اتنی کثیر دولت کہاں سے حاصل کی۔

ایسا ہر واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے اصلاحی قوانین نے صرف لوٹنے والوں کے لیے موقع فراہم کرنے کا کام کیا ہے۔ اس سے ان ہی لوگوں کو فائدہ پہنچا ہے جس کو ترقیاتی اسکیموں کے نفاذ پر مامور کیا گیا ہے، نہ کہ ان لوگوں کو جن کے لیے دراصل اسکیم بنائی گئی تھی۔

حکومت اسکیم بنائے گی کہ آئندہ پانچ سالوں کے اندر ملیریا کو سارے ملک میں نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ اس کے لیے حکومت کی طرف سے ڈی، ڈی، ٹی (جراثیم مارنے والی دوا) کے کارخانے کھولے جائیں گے اور ملیریا کنٹرول کے محکمے کو حکم دے دیا جائے گا کہ تمام انسانی رہائش گاہوں اور مویشیوں کے رہنے کی جگہوں میں بڑی شدت کے ساتھ جراثیم کش دوائیں چھڑکی جائیں۔ اس اسکیم پر عمل درآمد کے لیے ایک بہت بڑا عملہ سارے ملک میں حرکت میں آجائے گا، لیکن جب منصوبے کی مدت ختم ہو گی تو معلوم ہوگا کہ ''دارالسلطنت'' کی سطح کے بعض شہروں میں جہاں اعلیٰ ترین شخصیتیں قیام پذیر ہیں اور جہاں دنیا بھر کے سیاح ملک کی ''ترقیات'' دیکھنے کے لیے آتے رہتے ہیں، وہاں تو ضرور مچھروں کا خاتمہ ہو گیا ہے اور بقیہ سارے ملک میں اب بھی اسی طرح مچھر اور ملیریا کے جراثیم موجود ہیں، جیسے اس منصوبے کو شروع کرنے سے پہلے تھے۔

کیوں کہ مخصوص مقامات کے سوا ہر جگہ ڈی، ڈی، ٹی کے بجائے ''سفید پانی'' چھڑکا گیا تھا، اور دواؤں کی بہت بڑی تعداد یا تو بلیک مارکیٹ میں چلی گئی یا دوسرے ملکوں میں لے جا کر ناجائز طور پر فروخت کر دی گئی۔ البتہ اس اسکیم پر عمل کرنے کے لیے پبلک سے جو کروڑوں روپے بطور ٹیکس وصول کیے گئے تھے اس کی وجہ سے غریب عوام کی جیبیں کچھ اور خالی ہو جائیں گی اور وہ اس قابل نہ رہیں گے کہ بیمار ہوں تو اپنا اور اپنے بچوں کا علاج کر سکیں۔

حکومت سارے ملک میں پل، سڑکیں، مدرسے، بجلی گھر اور مختلف قسم کے کارخانے بنانے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس مقصد کے لیے اربوں روپے کے ٹیکس عوام کے اوپر لاد دئے جاتے ہیں۔ مگر عملاً یہ ہوتا ہے کہ ایک کروڑ روپے کی چیز جو عوام کے لیے بن کر تیار ہوتی ہے اس کے لیے قوم کے ۵۰ کروڑ اور ۱۰۰ کروڑ روپے خرچ ہو جاتے ہیں اور یہ مزید سرمایہ تھوڑے سے افسروں اور ٹھیکے داروں کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ اور اتنی مہنگی قیمت پر جو چیز بن کر تیار ہوتی ہے اس کا بھی یہ حال ہوتا ہے کہ چند سال کے بعد ہی اخباروں میں یہ خبر شائع ہو جاتی ہے کہ فلاں دریائی بند میں شگاف پڑ گئے ہیں کیوں کہ اس کی تعمیر میں خراب مسالہ استعمال کیا گیا تھا اور فلاں کارخانے کی بھاری مشین کو جتنے دن چلنا چاہیے تھا اس کے مقابلے میں وہ صرف تہائی مدت تک چل سکے گی کیوں کہ اس کی مشین حاصل کرنے کے لیے ایک ایسی فرم سے معاملہ کیا گیا تھا جو ناقص مشینری سپلائی کرنے کے لیے بدنام ہے۔ فلاں لوہے اور فولاد کا کارخانہ جو ڈیڑھ ارب کی لاگت سے تیار کیا گیا تھا اس کی بنیاد کے ستون ناقص طور پر نصب کر دیے گئے ہیں اور اب انہیں اکھاڑ کر از سرِ نو بنانا پڑے گا۔ پبلک کی گاڑھی کمائی سے لاکھوں روپئے وصول کر کے ایک سڑک بنائی جاتی ہے لیکن اس کے تیار ہونے کے چند مہینے بعد جب آپ اس پر سے گذرتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹ رہی ہے کیوں کہ ٹھیکیداروں کو سڑک کی تعمیر پر روپیہ صرف کرنے سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ رقم کا بڑا حصہ بچایا جائے تا کہ انجینیروں، اُورسیروں کو ان کا مقررہ حصہ ادا کیا جا سکے۔ ایک عظیم الشان نہر کی اسکیم بنتی ہے جس کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ ملک کے سب سے بڑے حصہ کو سیراب کرے گی۔ مگر جب وہ بن کر تیار ہوتی ہے اور کام کرنا شروع کرتی ہے تو حکومت کو شکایات موصول ہوتی ہیں کہ نہر میں پانی بہت کم آ رہا ہے۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اصل نقشہ کے مطابق نہر کو ایک سو میل تک پکی اینٹوں سے بننا تھا، کیوں کہ اس کا راستہ ایک بالو کے علاقے سے گزرتا تھا۔ اگر اس کی تہہ کو پختہ نہ کیا جاتا تو بالو سب پانی پی جاتا۔ یہ نہر بنائی تو گئی اینٹوں ہی

کی ،مگر پختہ اینٹوں کے بجائے کچی اینٹیں لگا دی گئیں۔اس طرح انجینیروں اور سرکاری افسروں نے اونچی تنخواہوں اور بڑے بڑے الاؤنسوں کے باوجود مزید منافع حاصل کرنے کے لیے ایک قومی منصوبے کو ناکام بنا دیا اور جو رقم نہر کی تعمیر کے لیے تھی اس کا بڑا حصہ بچا کر خود لے لیا۔

وہ سب سے بڑا مسئلہ جس نے آج کل ہر خاص وعام کو پریشان کر رکھا ہے، وہ مہنگائی کا مسئلہ ہے۔ پچھلے چند سالوں کے دوران میں چیزوں کی قیمتیں اتنی تیزی سے بڑھی ہیں کہ لوگوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا ہے کہ وہ محدود آمدنی میں اپنی ضرورت کیسے پوری کریں۔ پہلے معاش کا مسئلہ زیادہ تر بے روزگاری کا مسئلہ تھا، مگر اس مہنگائی نے روزگار والوں اور بے روزگاروں دونوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ جو نہیں کماتا اس کو یہ پریشانی ہے کہ کیا کھائے ،اور جو کماتا ہے اس کو یہ پریشانی ہے کہ اتنے کم پیسے میں خرچ کیسے پورا کرے۔

اس مہنگائی کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہی ترقیاتی اسکیموں کی ناکامی ہے۔حکومت عوامی ترقی کی ایک اسکیم بناتی ہے اور اس کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے تمام اشیاء اور ان کے استعمال کے ہر مرحلے پر بے حساب ٹیکس لگاتی ہے۔اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چیزوں کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ بڑھی ہوئی قیمتیں دراصل بڑھائے ہوئے ٹیکس ہیں جو سارے ملک سے اس لیے لازمی طور پر وصول کیے جاتے ہیں تاکہ حکومت اپنی ترقیاتی اسکیموں کو مکمل کر سکے۔مگر عملاً یہ ہوتا ہے کہ عوام سے تو ان کے حصے سے کہیں زیادہ قیمت وصول کر لی جاتی ہے۔مگر اس کے بدلے انہیں جو کچھ ملنا چاہیے اس کا چوتھائی حصہ بھی ان کو نہیں ملتا۔اس کو ایک چھوٹی سی مثال کے ذریعہ یوں سمجھئے کہ ایک گاؤں میں آبپاشی کے انتظامات کے لیے لوگوں سے ٹیکس وصول کیے جاتے ہیں۔اگر اس سرمائے سے کنوئیں اور نہریں تعمیر کی جائیں اور آبپاشی کے سامان خرید کر کھیتوں کی بروقت اور مکمل سنچائی کا باقاعدہ انتظام کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پیداوار بہت تیزی سے بڑھ جائے گی اور لوگوں سے جتنا روپیہ بطور ٹیکس وصول کیا گیا تھا اس سے زیادہ انہیں واپس مل جائے گا۔لیکن اگر وصول کرنے والے خود ہی وصول کیے ہوئے روپئے کو کھا جائیں تو نتیجے میں صرف یہ ہوگا کہ بستی کے چند لوگ تو بہت خوشحال ہو جائیں گے اور عام لوگوں کی زندگی پہلے سے زیادہ مصیبت میں پڑ جائے گی۔یہی حال زیادہ بڑے پیمانے پر ملک کی ترقیاتی اسکیموں کا ہے۔اس مقصد کے لیے پبلک سے جو رقم وصول کی جاتی ہے اس کا بہت بڑا حصہ مختلف طریقوں سے درمیانی طبقہ ہڑپ کر لیتا ہے اور بہت تھوڑا حصہ منصوبے کی تکمیل کی صورت میں ہمیں واپس ملتا ہے اور وہ بھی ایسی

ناقص شکل میں کہ اصل سے کئی گنا روپے خرچ کرنے کے بعد بھی اس کے مطالبات پورے نہیں ہوتے اور بننے کے تھوڑے دنوں بعد ہی اس کی اصلاح ومرمت کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ ترقیاتی منصوبوں سے کچھ لوگوں کو فائدہ ملنا اور تمام لوگوں کے حصے میں مہنگائی آنا یہ معنٰی رکھتا ہے کہ لوگوں سے ٹیکس وصول کر کے اس کو کچھ لوگوں کی جیبوں میں ڈالا جا رہا ہے۔ جو کچھ سب کو ملنا چاہیے وہ کچھ لوگوں کو دیا جا رہا ہے۔

یہ مسائل جو ملک کو گھیرے ہوئے ہیں ان کو حل کرنے کے لیے ادھر کچھ دنوں سے سوشلزم اور منصوبہ بندی کا نام بہت زیادہ لیا جانے لگا ہے۔ یہ بات جن الفاظ اور جن اصطلاحات میں بیان کی جاتی ہے، اس کے لحاظ سے وہ بظاہر ایک نئی چیز معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ حکومت کا دائرہ وسیع کر دیا جائے۔ پبلک کے اوپر حکومت کے اختیارات جو ابھی تک محدود تھے ان کو لامحدود کر دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ اصلاح حال کی ان ہی کوششوں کو جو پچھلے سالوں میں ناکام ہو چکی ہیں، آئندہ جاری رکھنے کے لیے نیا عنوان دینا ہے۔

سوشلزم یا منصوبہ بندی کا مطلب سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ ملک کے ذرائع ووسائل کو جس حد تک ممکن ہو، حکومت اپنے قبضہ میں لے لے، اور ان کو مفاد عام کے مطابق خرچ کرے۔ یہ کام حکومت پہلے سے کرتی رہی ہے۔ پھر جو طریق کار اب تک کوئی نتیجہ نہ دکھا سکا اسی سے آئندہ کسی بہتر انجام کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے۔ منصوبہ بندی کا مطلب صرف یہ ہے کہ اب حکومت کو زیادہ ٹیکس عائد کرنے کے اختیارات ہوں گے۔ وہ زمینوں اور کارخانوں کو اپنے اہتمام میں چلانے کے لیے قوانین بنا سکے گی۔ تجارت اور لین دین جو اب تک دو طبقوں، تاجر اور خریدار، کے باہمی عمل سے انجام پاتا تھا ــــــ اب اس میں ایک تیسرے فریق یعنی حکومت کا اضافہ ہو جائے گا۔ یہ حکومت کون ہے؟ یہ وہی سرکاری لوگ ہیں جن سے ہم پچھلے ۳۵ سالوں میں خوب واقف ہو چکے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اندر رشوت لیے بغیر کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ جن کو قومی کام سپرد کیا جائے تو وہ اس کام کو مکمل کرنے سے پہلے یہ سوچتے ہیں کہ کس طرح اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی جیب بھر لیں۔ پھر جن سرکاری کارکنوں نے اس سے پہلے اختیارات کو صحیح طور پر استعمال کرنے میں زبردست نااہلی کا ثبوت دیا ہے وہی لوگ دوبارہ وسیع تر اختیارات کے استعمال میں کس طرح اہل اور دیانت دار ثابت ہوں گے۔ سوشلسٹ سماج یا منصوبہ بند معاشیات کو خواہ کتابوں میں کتنے ہی خوبصورت الفاظ میں بیان کیا جائے مگر عملی

زندگی میں اس کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ پبلک کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر کام سے پہلے اس کے کرنے کے لیے سرکاری افسروں کے دستخط حاصل کریں۔ انگریزی حکومت کے زمانے میں پولیس کو یہ اختیارات تھا کہ وہ "امن عامہ" کے نام پر ہر ظلم کر سکتی ہے۔ اسی طرح سوشلسٹ ریاست میں سرکاری کارکنوں کو یہ حق مل جاتا ہے کہ وہ "مفاد عامہ" کے نام پر پبلک کی ہر چیز چھین سکتے ہیں۔ یہ چیز عام لوگوں پر سرکاری آدمیوں کے اختیارات بہت بڑھا دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک ہولناک قسم کا قانونی نظام وجود میں آتا ہے جو اپنے بوجھ کے نیچے تمام لوگوں کو دبا دیتا ہے۔ منصوبہ بندی اپنے عمل کے لحاظ سے وسیع پیمانے پر ایک جبر اور منظم قسم کی قانونی لوٹ ہے۔ اگست ۱۹۵۹ء میں وزیر غذا مسٹر اجیت پرشاد جین نے اپنے عہدے سے استعفا دیتے ہوئے کہا تھا کہ "ہمارے غلے کی سرکاری تجارت کی اسکیم کامیاب نہیں ہوئی ہے، کیوں کہ اس سلسلہ میں کنٹرول کی پالیسی اختیار کی گئی۔" انہوں نے کہا کہ "اگر غلے کی سرکاری تجارت کا اصول اختیار کرنا ہے تو اس کے لیے ہر سطح پر موثر کنٹرول کی ضرورت ہے۔" مگر موجودہ حالات میں کنٹرول کا فائدہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ "نجی دکانداروں" کے بجائے "ڈپو ہولڈروں" کا طبقہ وجود میں آئے اور لوٹنے والے نئے عنوان سے لوٹنا شروع کر دیں۔ ایک بگڑے ہوئے سماج میں سرکاری کنٹرول کے معنٰی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ رشوتوں اور بدعنوانیوں میں بے پناہ اضافہ ہو جائے اور تقسیم دولت کا عدم توازن نمایاں سے نمایاں تر ہوتا چلا جائے۔

اب میں مختصر طور پر بتانا چاہتا ہوں کہ اس صورت حال کے علاج کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس کے لئے ملک کے اندر تین قسم کی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے:

(۱) تبدیلیٔ فکر۔ (۲) تبدیلیٔ قانون۔ (۳) تبدیلیٔ قیادت۔

تبدیلیٔ فکر سے مراد یہ ہے کہ ہم اس تضاد کو ختم کریں جو ہمارے سماجی منصوبوں اور ہمارے تصورِ زندگی کے درمیان پایا جاتا ہے۔ ہم اپنے ملک میں ایسا سماج بنانا چاہتے ہیں جہاں تمام باشندے مشترک مقاصد کے لیے مشترک جدوجہد کریں، جس میں کوئی شخص دوسرے کا حق نہ مارے، جس میں آدمی اپنی ذات کے تقاضے پورے کرنے میں قوم کے تقاضے کو نظر انداز نہ کرے۔ ایسا ہی سماج ترقی یافتہ سماج کہا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی سماج میں امن و امان پایا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی سماج میں لوگ خوش حال رہ سکتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ہمارے ملک میں زندگی کا جو نظریہ اختیار کیا گیا ہے وہ خالص مادہ پرستانہ ہے جس کے معنٰی یہ ہیں کہ شخصی تمناؤں کی تکمیل کی

جگہ یہی دنیا ہے، اس دنیا میں جو شخص زیادہ حاصل کرلے وہ کامیاب ہے اور جو زیادہ حاصل نہ کر سکے وہ ناکام ہے۔ اس نظریے کے لازمی معنٰی یہ ہیں کہ ہر شخص اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مال و اسباب سمیٹنا چاہے، آدمی کی تمناؤں اور اس کی خواہشوں کی کوئی حد نہیں، اس لیے اس کا سمیٹنے کا جذبہ بھی کہیں ختم نہیں ہوتا۔

یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہم قومی زندگی میں جو کچھ چاہتے ہیں، شخصی زندگی میں خود ہی اس کی نفی کر رہے ہیں۔ ہندستان کے لیڈر اپنے ملک میں جس قسم کی سماجی زندگی بنانے کا آئے دن اعلان کرتے رہتے ہیں، وہ فرداً فرداً یہاں کے باشندوں کو اس کے خلاف تربیت دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی تعمیر میں ان افراد کو جہاں کہیں بھی استعمال کیا جاتا ہے وہ سماجی تعمیر کے بجائے اپنی ذات کی تعمیر میں لگ جاتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے ایک شخص کو کسی سماجی کام پر مامور کیا جاتا ہے۔ مگر سماجی کام کے لیے اس کے اندر کوئی محرک نہیں ہوتا۔ اس کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں اپنی ذات کے لیے ساز و سامان حاصل کرے۔ کیوں کہ اسی کا نام اس کے نزدیک اصل کامیابی ہے۔ وہ کاغذ پر سماجی کام کی خانہ پری کرتا رہتا ہے اور عملاً اپنی ذات کے فائدے حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اسی طرح کسی سماجی کارکن کو سماج کی خدمت کرنے کے لیے جو اختیار دیا جاتا ہے وہ اس کو اپنی لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ بنالیتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس تضاد کو ختم کیا جائے اور ایسے نظریے کو زندگی کا نظریہ بنایا جائے جو مادہ پرستی کے بجائے بالاتر حقیقت کی پرستش سکھاتا ہو۔ جو ایسے نقطے پر تمام انسانوں کو جمع کر سکے، جہاں انسان باہم متصادم ہونے کے بجائے ایک دوسرے سے متحد ہو سکیں، جو شخصی جذبات کو اجتماعی مفاد سے ہم آہنگ کر دے۔

ہمارے لیڈروں کو خود بھی اس تضاد کا احساس ہے مگر وہ اس کا حل صرف یہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو انصاف اور سچائی کی تلقین کرتے رہیں۔ حالانکہ ایسی ہر نصیحت صرف ضرورت کا احساس ہے، نہ کہ وہ ہماری ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ جب کوئی شخص سچائی کے راستے کو چھوڑ کر غلط راہ پر چلتا ہے تو وہ اس لیے ایسا کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس میں میرا دنیوی فائدہ ہے، جب وہ دیانتداری کے بجائے لوٹ کھسوٹ کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اس کے تصور زندگی کے مطابق اسی میں اس کی کامیابی ہے، پھر وہ کسی کی تلقین اور نصیحت سے کیوں اپنے فائدے کو چھوڑ دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی ایسا نظریہ اختیار نہ کیا جائے جو فائدہ اور نقصان کا ایک نیا تصور دیتا ہو۔ اس وقت تک صورتِ حال میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

یہ نظریہ صرف آخرت کا نظریہ ہے جو خدا اور مذہب کو ماننے کے بعد لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ زمین پر اس وقت ہم جو زندگی گذار رہے ہیں، یہی آخری زندگی نہیں ہے بلکہ اس کے بعد ایک اور طویل زندگی ہے جو مرنے کے بعد سامنے آئے گی، جہاں کائنات کا مالک اپنے بندوں سے ان کے پورے کارنامۂ زندگی کا حساب لے گا۔ موجودہ دنیا کوشش کرنے کی جگہ ہے اور بعد کی دنیا کوششوں کا انجام پانے کی جگہ۔ یہ نظریہ آدمی کی نگاہ میں موجودہ دنیا کی نعمتوں کو بے حقیقت بنا دیتا ہے۔ وہ آج کی دنیا سے زیادہ کل کی دنیا کا حریص بن جاتا ہے۔ ہر شخص کو سب سے پہلے جس بات کی فکر ہوتی ہے وہ یہ کہ اپنے مستقبل کو بہتر بنائے۔ اب اگر یہ نظریہ ہو کہ یہی دنیا حال بھی ہے اور مستقبل بھی تو ظاہر ہے کہ آدمی کی اولین خواہش یہ ہوگی کہ وہ دنیا میں بہتر زندگی حاصل کرے۔ وہ تمام ممکن مواقع کو اس کے لیے استعمال کرنا شروع کر دے گا خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز۔ اس کے برعکس جب آدمی خدا پر ایمان لاتا ہے اور آخرت کا نظریہ اختیار کرتا ہے تو وہ عین اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ دنیا میں ناانصافی کرنے اور دوسرے کا حق مارنے سے بچے۔ یہ نظریہ آدمی کو خدا سے ڈراتا ہے جو اس کی تمام کھلی اور چھپی حرکتوں کو دیکھ رہا ہے اور جس سے بھاگ کر وہ کہیں جا نہیں سکتا۔ اس طرح آدمی مجبور ہوتا ہے کہ اپنی آئندہ زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے اپنی موجودہ زندگی میں صحیح رویہ اختیار کرے اور اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرے۔ اس طرح یہ نظریہ ان تمام رخنوں کو پر کر دیتا ہے جو ہماری تمدنی سرگرمیوں میں پیدا کیا گیا ہے۔ یہ ہمارے شخصی رجحانات کو ہماری سماجی زندگی سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ یہ اس نظریے کی ایسی خصوصیت ہے جو کسی بھی دوسرے نظریہ کو حاصل نہیں ہے۔ فرد کے جذبات اور اجتماعی فلاح کے درمیان جو تضاد پایا جاتا ہے اس کو صرف یہی ایک نظریہ ختم کرتا ہے۔ دوسرا کوئی نظریہ اب تک پیش نہیں کیا جا سکا جو اس مشکل کا جواب ہو۔

اصلاح کے سلسلے میں دوسرا قدم یہ ہے کہ قانون کو بدلا جائے۔ قانون انسانی زندگی کا رہنما ہے۔ قانون کسی سماج کی وہ سب سے طاقتور چیز ہے جو زندگی کی شکلوں کو متعین کرتا ہے، مگر اس قانون کا تعین نہایت مشکل کام ہے۔ اس کے لیے نفسیات کا حقیقی علم ہونا ضروری ہے، اس کے لیے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ ایک شخص کا کوئی عمل دوسرے شخص پر کیا اثر ڈالتا ہے، اس کے لیے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ خارجی دنیا سے ہمارے تعلق کی صحیح ترین نوعیت کیا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ معلوم ہو کہ کتنی باتوں کو قانون کے دائرہ میں لیا جائے اور کس کو اس سے الگ چھوڑ دیا جائے۔ یہ باتیں انسان معلوم نہیں کر سکتا۔ اس لیے انسان اپنے

لیے قانون بھی نہیں بنا سکتا۔ چند مثالوں سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

۱۔ الٰہی شریعتوں نے جان مارنے کی سزا جان قرار دی ہے، اسی کے اثر سے یہ قانون ساری دنیا میں رائج ہو گیا اور قدیم ترین زمانے سے نسل انسانی اس کو تسلیم کرتی چلی آ رہی ہے۔ مگر اب کچھ دنوں سے جگہ جگہ اس کے خلاف رائے رکھنے والے لوگ پیدا ہو رہے ہیں۔ قاتل کو قتل کرنا انصاف کے خلاف سمجھا جانے لگا ہے اور اس کو ایک وحشیانہ فعل قرار دیا جاتا ہے، مگر جب بھی کسی ملک میں اس پر عمل کیا گیا تو تجربے نے ظاہر کر دیا کہ خدا کا مقرر کیا ہوا قانون ہی صحیح ترین قانون ہے۔ مثلاً لنکا کی اسمبلی نے ۱۹۵۶ء میں ایک قانون پاس کیا جس کے مطابق لنکا کی حدود میں موت کی سزا کو ختم کر دیا گیا۔ اس قانون کے بعد لنکا میں تیزی سے جرائم بڑھنا شروع ہو گئے۔ مگر کسی کو ہوش نہیں آیا، حتیٰ کہ اس قانون کے تیسرے سال ماہرین کا ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس کا کام یہ تھا کہ وہ اس کے نتائج کی چھان بین کرے۔ کمیشن نے رپورٹ دی کہ پچھلے سالوں میں اس قانون کا جو تجربہ ہوا ہے وہ اطمینان بخش ہے اور اس کو بدلنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ مگر ۲۶ ستمبر ۱۹۵۹ء کو جب ایک شخص نے لنکا کے وزیر اعظم مسٹر بندرانائک کے مکان میں گھس کر نہایت بے دردی کے ساتھ ان کو قتل کر دیا تو لوگوں کی آنکھ کھلی اور وزیر اعظم کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے فوراً بعد لنکا کی حکومت ۱۹۵۶ء کے ایکٹ کو منسوخ کر کے ملک میں سزائے موت کو دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وزیر قانون کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس سلسلے میں فوری طور پر ایک مسودہ تیار کر کے پارلیمنٹ میں پاس ہونے کے لیے پیش کریں۔

یہ تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان انسان کی نفسیات کو نہیں جانتا۔

۲۔ الٰہی شریعتوں میں جس طرح چوری اور ڈکیتی جرم ہے، اسی طرح اس نے شراب پینے کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ بظاہر ان دونوں چیزوں میں کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا، مگر جب انسانی قانون سازوں نے ایک کو حرام اور دوسرے کو حلال کیا تو تجربے نے فوراً ظاہر کر دیا کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر جرائم کو روکنا ہے تو شراب کو بھی ختم کرنا پڑے گا اور اگر شراب نوشی کو باقی رکھا گیا تو جرائم کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔ سری نگر میں ایک شخص کو گرفتار کیا گیا جو لوگوں کی سائیکلیں چرایا کرتا تھا۔ وہ بازار میں جاتا اور جہاں کہیں سائیکلیں کھڑی دیکھتا اس پر سوار ہو کر تیزی سے روانہ ہو جاتا اور دور کہیں لے جا کر اسے بیچ دیتا۔ گرفتاری کے بعد اس سے پوچھا گیا کہ تم کو ایسا کرنے کی ہمت کس طرح ہوتی ہے، کیا تمہارا ضمیر تم کو ملامت نہیں کرتا کہ تم

دوسرے کی چیز لے کر نہ بھاگو۔ کیا تم اس سے نہیں ڈرتے کہ پکڑے جاؤ گے تو تم کو سخت سزا بھگتنا پڑے گی۔ اس نے جواب دیا کہ میں بھی انسان ہوں اور مجھ پر بھی اس قسم کے احساسات طاری ہوتے ہیں، مگر اس کا حل میں نے یہ نکالا ہے کہ جب مجھے ایسا کرنا ہوتا ہے تو میں شراب پی لیتا ہوں۔ شراب کا نشہ طاری ہونے کے بعد یہ دونوں احساسات دب جاتے ہیں۔ شراب مجھے ضمیر کی ملامت سے آزاد کر دیتی ہے اور اس ڈر کو بھی میرے دل سے نکال دیتی ہے کہ پکڑ لیے جاؤ گے تو تم کو سزا ملے گی۔

یہ تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان اشیاء کے باہمی تعلق کو نہیں جانتا۔

۳۔ جن چیزوں کو انسان اپنی ملکیت کہتا ہے وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو براہِ راست ذاتی کوشش سے آدمی کو حاصل ہوئی ہو، اور دوسرے جائداد کی آمدنی جس پر آدمی خود محنت نہیں کرتا بلکہ حق ملکیت کے طور پر وہ اسے حاصل ہوتی ہے۔ الٰہی شریعتوں نے ان دونوں قسموں کی آمدنیوں کو انسان کا جائز حق تسلیم کیا ہے اور دوسرے کے لیے اس پر دست درازی کرنا جرم قرار دیا ہے۔ مگر صنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں کچھ سوشلسٹ مفکرین پیدا ہوئے جنھوں نے معاشی تجزیہ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جائداد بنانا صرف سماج کا حق ہے۔ دوسرے لفظوں میں فرد کے لیے صرف پہلے قسم کی آمدنی جائز ہے۔ دوسرے قسم کی آمدنی اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ اس فلسفہ کے مطابق، کسی شخص کی وہی آمدنی اس کی جائز ہے جو اس نے ذاتی طور پر محنت کر کے کمائی ہو۔ کسی جائداد سے حاصل شدہ آمدنی کو وہ اپنی ملکیت نہیں بنا سکتا۔ اس نظریے کو پچھلے سو برس میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور ساری دنیا میں اس کا چرچا کیا جانے لگا ہے۔ ہمارے ملک کے لیڈر بھی اس فلسفے سے متاثر ہیں۔ چنانچہ آزادی کے بعد ہندستان میں آراضی کی اصلاح کے جو قوانین بنے ہیں ان میں یہ تصور شامل ہو گیا ہے۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ خاتمہ زمینداری کے قوانین میں اس قسم کی دفعات شامل کی گئیں، جن کا مطلب یہ تھا کہ کھیت کا مالک وہ نہیں ہے جس نے خرید کر یا عطیہ اور وراثت کے ذریعہ اس کو حاصل کیا ہو، بلکہ کھیت کا مالک وہ ہے جو کھیت کے اوپر ہل چلائے، ''جو بوئے اس کا کھیت''۔ یہ اس خیال کے لوگوں کا نعرہ ہے۔ مگر جب یہ قانون رائج کیا گیا تو آپ نے دیکھا کہ اس کا انجام کیا ہوا۔ ایک قسم کی جائداد سے انفرادی ملکیت ختم کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر قسم کی ملکیت کا احترام دلوں سے اٹھ گیا۔ ہر شخص اپنا یہ حق سمجھنے لگا کہ وہ جہاں کہیں موقع پائے دوسرے کی ملکیت پر قبضہ کر لے۔ ایک دوسرے کے کھیتوں پر قبضہ کرنے کے

لیے زبردست جھگڑے ہوئے، چوری اور ڈکیتی بالکل عام چیز بن گئی۔ بعض بعض مقامات پر تو یہ حال ہے کہ راستہ چلنا دشوار ہے۔ دن دہاڑے مسافروں کو روک کر ان کا سامان چھین لیا جاتا ہے۔ یہ تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان اس بات کو نہیں جانتا کہ خارجی دنیا سے ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت کیا ہے۔

اوپر میں نے انسانی قانون سازی کی ناکامیوں کی جو مثالیں دی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی کا قانون متعین کرنے کے لیے جن معلومات کی ضرورت ہے وہ انسان کو حاصل نہیں ہیں اور ان معلومات کے بغیر قانون بنانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سرجری اور علم الاعضاء کی تعلیم حاصل کیے بغیر انسانی جسم کی چیر پھاڑ شروع کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کوشش صرف دشواریوں میں اضافہ کرے گی، وہ دشواریوں کا علاج نہیں بن سکتی۔ اس لیے ہمارا مطالبہ ہے کہ خدائی قانون کو تسلیم کیا جائے اور اسی کی روشنی میں تمام سماجی معاملات کا فیصلہ کیا جائے۔ انسان جب تک اس روشنی کو اپنا رہنما نہیں بنائے گا وہ اندھیرے میں بھٹکتا رہے گا، وہ کبھی صحیح قانون تک نہیں پہنچ سکتا۔

تیسری چیز جو ہم ملکی حالات کی اصلاح کے لیے ضروری سمجھتے ہیں وہ قیادت کی تبدیلی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ملک کے اختیارات ان لوگوں کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں، جو ملک کو صحیح سمت میں لے جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اصلاح کا ہر کام اگرچہ تبلیغ سے شروع ہوتا ہے مگر اپنی تکمیل کے لیے وہ لازمی طور پر طاقت چاہتا ہے۔ اگر مصلحین صرف زبانی تبلیغ پر اکتفا کریں اور سیاسی اختیارات کے استعمال کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیں تو سماجی اصلاح کی کوشش ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ہمارے وہ سیاسی لیڈر بڑے ہی نادان تھے جنھوں نے یہ سمجھا تھا کہ ملک میں سیاسی تبدیلی آنے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ یہاں کے سماجی حالات بھی بدل جائیں گے، اسی طرح وہ لوگ بھی نہایت نادان ہوں گے جو یہ سمجھیں کہ محض تبلیغ اور نصیحت سے کسی ملک کی اجتماعی زندگی میں کوئی انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ جس طرح فکری تبدیلی کے بغیر سیاسی بتدیلی بے معنٰی ہے۔ اسی طرح فکری تبدیلی کی کوشش بھی اس وقت تک کوئی بڑا نتیجہ پیدا نہیں کرسکتی جب تک سیاسی طاقت بھی اس کی مددگار نہ ہوجائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تبدیلیٔ فکر کی کوشش کبھی ان معنوں میں کامیاب نہیں ہوسکتی کہ سوسائٹی کے تمام لوگ اس کے ہم نوا بن جائیں۔ کوئی تحریک جب کسی جگہ تبدیلیٔ فکر کی مہم شروع کرتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک طرف سوسائٹی کے تمام لوگ یہ جان لیں کہ ان کے درمیان کون سی طاقت ابھر رہی ہے، تاکہ جب یہ نیا فکر برسرِ اقتدار آئے تو وہ لوگوں کے لیے اجنبی نہ ہو۔ دوسری طرف اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ

ایک قلیل مدت میں مسلسل کام کر کے سوسائٹی کے ان تمام لوگوں کو چھانٹ لیا جائے جو اس نئے فکر کو قبول کرنے کی نسبتاً زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں اور جن سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جب اس نئے فکر کو غلبہ حاصل ہو تو اس کے مقصد اور مزاج کے مطابق نئے انتظام کو چلاسکیں۔ جوں ہی یہ دونوں کام ایک حد تک انجام پا جاتے ہیں، تحریک براہِ راست اقدام شروع کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے۔

یہ قیادت کی تبدیلی اس فکری اور قانونی تبدیلی کا لازمی تقاضا اور اس کی تکمیل ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ کسی سماج کے اندر فکری اور قانونی تبدیلی اس ارادے کا اظہار ہے کہ وہ ایک دوسرے نظام کے تحت زندگی گزارنے کا خواہش مند ہے، اور سماج کے سیاسی ادارے یعنی حکومت، کی تبدیلی اس ارادے کو عملی شکل دینا ہے۔ جب ہم سماج کے فکر کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں تو گویا ہم سماج کے اندر ایک ارادہ ابھارتے ہیں اور جب ہم قیادت کو بدلنا چاہتے ہیں تو گویا ہم بدلے ہوئے ارادے کو خارجی دنیا میں لا رہے ہیں۔

قیادت کی تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ تمام افراد کی اصلاح کے لیے ان کے اندر جس ذہنیت کا پیدا ہونا ضروری ہے وہی ذہن ان لوگوں کا بھی ہونا چاہیے جو سماج کے اعلیٰ ترین اختیارات پر فائز ہوتے ہیں۔ آخرت کا فکر رکھنے والے اور خدا کے قانون کو ماننے والے لوگ جب حکومت کا کاروبار سنبھالیں گے اسی وقت یہ ممکن ہے کہ لوٹ کھسوٹ نہ ہو، اور ایسے ہی لوگ ایسا کر سکتے ہیں کہ حقدار کو اس کا پورا پورا حق پہنچائیں۔ فکر آخرت سے بے پروا اور خدائی قانون سے آزاد قیادت کبھی بھی ملکی حالات کو درست نہیں کر سکتی۔ آج ہمارے ملک کا حال یہ ہے کہ جو شخص نیل گری کی چوٹیوں پر کھڑا ہو کر اعلان کرتا ہے کہ ''میں خدا سے نہیں ڈرتا'' اسی کو حکومت میں سب سے بڑا عہدہ مل جاتا ہے، اور جو شخص پارلیمنٹ میں جا کر کہتا ہے کہ ''خدا کو ہمارے قانونی معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہے'' اس کو قانون ساز مجلس کا صدر بنا دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس ملک کا اختیار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو اس ملک کا انجام وہی ہوسکتا ہے جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

اس لیے ضرورت ہے کہ زندگی کا نظریہ، ملکی قانون اور سیاسی اقتدار تینوں کو بدلا جائے۔ اگر ملک کے حالات کو بدلنا ہے تو ہمیں یہ تمام تبدیلیاں لانی ہوں گی اور اگر ہم یہ تبدیلیاں نہیں لاتے تو ہرگز ہمارے حالات بدل نہیں سکتے۔